مشکل القرآن کے حل میں امام رازیؒ کا منہج: اصول و اسالیب کا تجزیاتی مطالعہ

Imam al-Razi's Methodology for Resolving Difficulties in the Qur'an: An Analytical Study of His Principles and Approaches

Obaidullah
PhD Research Scholar in Islamic Studies and Religious Affairs,
University of Malakand
Email: obkhan27@gmail.com
Dr. Najmul Hassan (Corresponding Author)
Associate Professor in Islamic Studies and Religious Affairs,
University of Malakand
Email: najmulh639@gmail.com
Dr. Muhammad Abdul Haq
Lecturer in Islamic Studies and Religious Affairs,
University of Malakand
Email: mabdulhaq.pk@gmail.com

Abstract
"Difficult passages in the Qur'an" (Mushkil al-Qur'an) refer to verses whose meanings are obscure, ambiguous, or appear to conflict with other scriptural texts or with established legal, linguistic, or rational principles. This study addresses the ongoing and evolving nature of such issues, emphasizing the need to clarify the methodologies of leading scholars so that researchers can effectively respond to intellectual and theological challenges related to Qur'anic interpretation.
The aim of this research is to understand the nature of Mushkil al-Qur'an and to highlight the methodological approach of Imam Fakhr al-Din al-Razi in resolving these difficulties. The study adopts an inductive and analytical method. It examines the concept of Mushkil al-Qur'an, its underlying wisdom, al-Razi's engagement with the subject, and his strategies for addressing interpretive challenges.
The findings reveal that Imam al-Razi was a polymath who devoted significant attention to resolving problematic Qur'anic passages. While he shared common methods with other scholars, his distinctive approach lies in his extensive use of rational argumentation, interpretive analysis (ta'wil), logical and theological principles, and rhetorical insights to address and resolve apparent difficulties in the Qur'anic text.
Keywords: Mushkil al-Qur'an, Imam Fakhr al-Din al-Razi, interpretive challenges

اس تحقیق میں امام فخر الدین رازیؒ کے "مشکلاتُ القرآن" سے متعلق اختیار کردہ منہج اور طریقۂ کار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ "مشکلُ القرآن" سے مراد قرآنِ کریم کے وہ مقامات ہیں جن کے معانی بظاہر واضح نہ ہوں، یا وہ کسی دوسرے مفہوم کے ساتھ مشتبہ محسوس ہوں، یا کسی شرعی نص، معتبر اصولِ شرع، لغت یا عقلی و علمی قاعدے کے ساتھ ظاہری تعارض رکھتے دکھائی دیں۔

اس تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مشکلُ القرآن کا موضوع ہر دور میں علمی و فکری مباحث کا مرکز رہا ہے، اور نئے شبہات و اشکالات کے پیدا ہونے کے ساتھ اس کی اہمیت مزید بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ائمۂ تفسیر کے مناہج کو واضح کیا جائے، تاکہ معاصر محققین اور طلبۂ علم قرآنِ کریم کے مشکل مقامات سے متعلق پیدا ہونے والے علمی و فکری اشکالات کا مؤثر انداز میں جواب دے سکیں۔

اس تحقیق میں امام فخر الدین الرازیؒ کے "مشکلات القرآن" کے بارے میں اختیار کردہ طریقۂ کار کو بیان کیا گیا ہے۔ "مشکل القرآنّ" سے مراد وہ مقام ہے جس کا معنی واضح نہ ہو، یا کسی اور چیز کے ساتھ خلط ملط ہو جائے، یا کسی شرعی نص یا معتبر اصول (شرعی، لغوی یا علمی) کے ساتھ بظاہر متعارض نظر آئے۔

اس مطالعے میں مشکلُ القرآن کے مفہوم، اس کی حکمت و اہمیت، امام رازیؒ کی اس موضوع سے خصوصی دلچسپی، اور قرآنِ کریم کے مشکل مقامات کے حل میں ان کے اصول و اسالیب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

مشکل کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

لغت میں لفظ مُشْكِل عربی زبان کے ثلاثی مادہ (ش ک ل) سے ماخوذ ہے، اور یہ مادہ بنیادی طور پر مماثلت، مشابہت، ہم شکلی اور ہم صورتی کے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

ابن فارس (م: 395ھ) اس مادہ کے بارے میں لکھتے ہیں: " الشِّينُ وَالْكَافُ وَاللَّامُ مُعْظَمُ بَابِهِ الْمُمَاثَلَةُ "۔ یعنی (ش ک ل) شین، کاف اور لام کا بنیادی اور غالب مفہوم مماثلت (مشابہت) ہے۔ ابن فارس مزید وضاحت کرتے ہیں کہ عربی زبان میں جب کہا جاتا ہے: "هَذَا شكلُ هَذَا" تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ چیز دوسری چیز کی ہم صورت، ہم شکل اور مثل ہے۔ اسی بنا پر مشکل اس وقت بولا جاتا ہے جب دو چیزیں باہم اس قدر مشابہ ہو جائیں کہ ان میں امتیاز باقی نہ رہے اور نتیجتاً التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے۔[(1)]

علامہ ابن منظور افریقیؒ (م: 711ھ) کے مطابق الشَّكْل (شین کے فتح کے ساتھ) شِبہ، مثل اور صورت کے معنیٰ میں آتا ہے، اس کی جمع أشكال اور شُكُول ہے۔ عرب کہتے ہیں فِي فُلَانٍ شَبَهٌ مِنْ أَبيه وشَكْلٌ یعنی

فلاں میں اپنے باپ کی مشابہت اور صورت ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے کہ هَذَا مِنْ شَكْلِ هَذَا أَيْ مِنْ ضَرْبِهِ وَنَحْوِهِ یعنی یہ اسی کی قسم اور اسی کی مانند ہے۔[2]

علامہ فیروزآبادیؒ (م:817ھ) کے مطابق: "الْمُشْكِلُ: مَا يُلْبِسُ وَيُشَبِّهُ غَيْرَهُ بِغَيْرِهِ. "یعنی "مشکل" وہ چیز ہے جو التباس پیدا کرے اور ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مشابہ بنا دے۔[3]

اس لغوی تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ "مُشْکِل" کے بنیادی معانی عربی لغات میں مماثلت، مشابہت، اختلاط اور التباس کے گرد گھومتے ہیں۔ جب یہ مشابہت اس حد تک بڑھ جائے کہ امتیاز ختم ہو جائے تو فہم میں اشتباہ پیدا ہوتا ہے، اور اسی حالت کو "مُشْکِل" کہا جاتا ہے۔ اسی لغوی بنیاد پر "مشکلات القرآن" کی اصطلاح وجود میں آئی۔

اصطلاحی تعریف: "مشکلُ القرآن" ایک وسیع اور جامع اصطلاح ہے، جو قرآنِ کریم کی آیات میں پائے جانے والے ہر اُس اشکال کو شامل کرتی ہے جس کے فہم کے لیے توضیح، تحقیق اور تدبر کی ضرورت ہو۔

علامہ ابن قتیبہ الدینوری (م:۲۷۶ھ) "مشکل" کو "متشابہ" کے قریب قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: "ومثلُ المتشابهِ المشكلُ، وسُمِّي مشكلاً لأنه أَشكَلَ؛ أي دخل في شكل غيره فأشبهه وشاكله، ثم يقال لكل ما غمض وإن لم يكن غموضه من هذه الجهة مشكلاً "[4]" اور 'متشابہ' کی طرح 'مشکل' بھی ہے، اور اسے 'مشکل' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ (اپنی صورت و ہیئت میں) کسی دوسری چیز کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ اس کے مشابہ اور ہم شکل نظر آنے لگتا ہے۔ پھر ہر اس چیز کو 'مشکل' کہا جانے لگا جو غیر واضح اور پیچیدہ ہو، خواہ اس کی پیچیدگی کا سبب (شکل و صورت کا اشتراک) نہ بھی ہو۔"

علامہ زرکشیؒ (م: ۷۹۴ھ) نے علومِ قرآن کے ضمن میں "مشکل" کو "متشابہ" کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے: "والمتشابهُ مثلُ المشكل؛ لأنه أَشكَلَ أي دخل في شكل غيره وشاكله"[5]" اور متشابہ، مشکل ہی کی طرح ہے؛ کیونکہ یہ اپنی صورت بدل کر کسی دوسری شکل میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کے مشابہ و ہم شکل بن جاتا ہے۔"

محمد رواّس قلعجی (م:۱۴۳۵ھ) لکھتے ہیں: "مشکلِ قرآن یا مشکلِ آثار سے مراد وہ نص ہے جس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے گہری غور و فکر اور باریک بینی درکار ہو، یا جس کے بارے میں بظاہر کسی تعارض کا گمان پیدا ہوتا ہو۔"

ڈاکٹر احمد القُصیر کے ہاں "مشکل" کی جامع اور مانع تعریف یہ ہے کہ "مشکلُ القرآن" اُن قرآنی آیات کو کہا جاتا ہے جن کا ظاہری مفہوم کسی دوسری دلیل یا نص کے ساتھ بظاہر تعارض کا وہم پیدا کرے؛ خواہ وہ دوسری دلیل قرآن کی آیت ہو، یا کوئی ثابت شدہ حدیثِ نبوی، یا اجماع، قیاس، کوئی ثابت شرعی قاعدہ کلیہ، لغوی اصل، سائنسی حقیقت، حسی مشاہدہ یا عقلی دلیل ہو۔[6]

اس تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں لغوی اور اصطلاحی اشتراک کی وجہ سے "مشکل" اور "متشابہ" کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں علومِ قرآن کی تدوین کے ساتھ دونوں اصطلاحات میں فرق کیا گیا۔ جدید علماء نے "مشکلُ القرآن" کو "متشابہ" سے زیادہ وسیع اور مستقل اصطلاح قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک مشکلُ القرآن میں وہ تمام آیات شامل ہیں جن میں بظاہر اشکال، تعارض یا فہم کی دشواری پائی جائے، جبکہ متشابہ کا دائرہ نسبتاً محدود ہے، جو عموماً اُن آیات سے متعلق ہوتا ہے جن کے حقیقی معانی یا مرادات تک رسائی میں اشتباہ پایا جائے۔

مشکلات القرآن کے حل میں امام رازی کا منہج

1۔ جمع و تطبیق: شرعی نصوص میں بعض اوقات ایسا بظاہر تعارض محسوس ہوتا ہے جو فہمِ قرآن میں اشکال کا باعث بنتا ہے۔ مفسرین کی عمومی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان نصوص کے درمیان تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کی جائے تاکہ حقیقی تضاد باقی نہ رہے۔ امام فخر الدین رازیؒ اس میدان میں نہایت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ پہلے نص کے ظاہری اشکال کی نشاندہی کرتے ہیں، پھر مختلف آیات کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلی مثال: اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا﴾[7] جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کفار قیامت کے دن نہ دیکھ سکیں گے، نہ سن سکیں گے اور نہ بول سکیں گے۔ لیکن بعض دیگر آیات میں اس کے برخلاف مفہوم ظاہر ہوتا ہے، مثلاً: ﴿وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ﴾[8]، ﴿سَمِعُوا لَهَا تَغَيُّظًا وَزَفِيرًا﴾[9]، ﴿يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا﴾[10]، اور ﴿وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ﴾[11]، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیکھیں گے، سنیں گے اور گفتگو بھی کریں گے۔ امام رازیؒ اس ظاہری تعارض کو دو طریقوں سے حل کرتے ہیں: اول یہ کہ قیامت کے مختلف مراحل اور مقامات ہوں گے، بعض مواقع پر انہیں بولنے یا دیکھنے کی اجازت ہوگی، جبکہ بعض حالات میں وہ اس سے محروم ہوں گے۔ دوم یہ کہ "نہ دیکھنا، نہ سننا اور نہ بولنا" سے مراد حقیقی عدمِ حواس نہیں بلکہ مجازی مفہوم ہے، یعنی وہ ایسی چیزیں نہیں دیکھ سکیں گے جو ان کے لیے باعثِ راحت ہوں، نہ ایسی بات سن سکیں گے جو فائدہ مند ہو، اور نہ کوئی ایسی دلیل پیش کر سکیں گے جو ان کے حق میں قبول کی جائے۔[12]

اس طرح امام رازیؒ کا منہج یہ واضح کرتا ہے کہ وہ نصوص کے ظاہری تعارض کو تطبیق، سیاق اور مجازی تعبیر کے ذریعے حل کرنے میں خصوصی مہارت رکھتے ہیں۔

دوسری مثال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿خَلَقَ الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾(13) یعنی انسان کو کھنکھناتی، پکی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا۔ بظاہر یہ مضمون ان آیات کے ساتھ مختلف معلوم ہوتا ہے جن میں انسان کی تخلیق کبھی مٹی، کبھی گیلی مٹی (طین)، کبھی سڑی ہوئی کیچڑ (حما) اور کبھی نطفہ سے بیان کی گئی ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ کے نزدیک ان آیات میں کوئی حقیقی تعارض نہیں، بلکہ یہ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے مختلف مراحل کو بیان کرتی ہیں۔ یعنی تخلیق کا آغاز مٹی سے ہوا، پھر وہ گیلی مٹی بنی، پھر سڑی ہوئی کیچڑ کی صورت اختیار کی، پھر چکنے والی مٹی بنی، اور آخر میں وہی مادہ کھنکھناتی مٹی کی شکل میں ڈھل گیا۔

جہاں تک نطفہ (پانی) سے تخلیق کا ذکر ہے، امام رازیؒ اس کی تطبیق یوں کرتے ہیں کہ یہ انسان کی دو مختلف نسبتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت آدمؑ کی اصل مٹی سے ہے، جبکہ ان کی نسل نطفہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح اصل کے اعتبار سے انسان مٹی کی طرف منسوب ہے، اور موجودہ پیدائش کے اعتبار سے نطفہ کی طرف۔(14)

یوں امام رازیؒ واضح کرتے ہیں کہ ان آیات میں اختلاف نہیں بلکہ تخلیق کے مختلف پہلوؤں اور مراحل کا بیان ہے۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ امام فخر الدین رازیؒ آیات کے بظاہر اختلاف کو تطبیق کے ذریعے دور کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ حدیث، اقوالِ صحابہؓ و تابعینؒ، اور لغوی و بلاغی توجیہات سے رہنمائی لیتے ہیں۔ وہ کبھی سیاق و سباق، کبھی مجازی و لغوی اسلوب، اور کبھی مختلف اعتبارات یا حالات کے فرق سے آیات میں ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں، جیسے کنایہ، استثناءِ منقطع اور دیگر اسالیب کے ذریعے اشکال کو رفع کرنا۔

2۔ بیانِ نسخ: کبھی آیات کے درمیان بظاہر تعارض نسخ کے اختلاف کی وجہ سے محسوس ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر مفسر کا یہ فیصلہ کہ نسخ ثابت ہے یا نہیں، اشکال کے حل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ اس باب میں انتہائی محتاط ہیں؛ وہ نسخ اسی وقت قبول کرتے ہیں جب اس پر واضح دلیل موجود ہو، اور جہاں تطبیق یا تخصیص ممکن ہو وہاں نسخ کی طرف نہیں جاتے۔ اس کی مثال عدتِ وفات سے متعلق آیات ہیں: ایک آیت میں چار ماہ دس دن کی عدت بیان ہوئی ہے ﴿أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾15، جبکہ دوسری میں ایک سال تک وصیت کا ذکر ہے ﴿مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ﴾16۔

جمہور علماء کے نزدیک ان آیات کے درمیان بظاہر تعارض کو نسخ کے ذریعے حل کیا گیا ہے، لیکن امام فخر الدین رازیؒ نے مجاہدؒ اور ابو مسلم اصفہانیؒ کے قول کو ترجیح دیتے ہوئے نسخ کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کے نزدیک نسخ اصل کے خلاف ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو تطبیق کو اختیار کرنا چاہیے، اور تعارض کی صورت میں تخصیص نسخ سے بہتر ہے۔17

اس بنا پر آیات کی تطبیق یوں کی گئی کہ مجاہدؒ کے مطابق ایک سال کی مدت اختیاری ہے، جبکہ لازم عدت چار ماہ دس دن ہے۔ ابو مسلمؒ کے نزدیک بھی ایک سال صرف جواز ہے، لازم حکم نہیں۔ اس طرح امام رازیؒ کے نزدیک بغیر نسخ کے دونوں آیات میں تطبیق ممکن

ہے اور تعارض ختم ہو جاتا ہے۔[18]

3۔بظاہر ناممکن معانی کی توجیہ اور اشکالات کا ازالہ: امام فخر الدین رازیؒ ایسے مقامات پر جہاں کسی آیت کا ظاہری مفہوم بعید یا ناممکن معلوم ہو، وہاں وہ قرآن کے نظم اور معنوی ہم آہنگی کو سامنے رکھ کر ایسی توجیہ اختیار کرتے ہیں جو اشکال کو دور کر دے۔

اس کی مثال حضرت لوطؑ کے قول میں ہے: ﴿هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾۔[19] ایک رائے کے مطابق اس سے مراد ان کی حقیقی بیٹیاں ہیں، جبکہ مجاہدؒ اور سعید بن جبیرؒ کے مطابق اس سے مراد قوم کی عورتیں ہیں، کیونکہ نبی اپنی امت کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا ہے۔

امام رازیؒ اسی دوسرے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور دلیل دیتے ہیں کہ عربی زبان میں ادنیٰ نسبت بھی اضافت کے لیے کافی ہوتی ہے، اور نبی کا اپنی امت کے ساتھ روحانی تعلق اس تعبیر کو درست بناتا ہے۔ اس کی تائید قرآن کی آیت ﴿وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ﴾[20] سے بھی ہوتی ہے۔ اس طرح وہ بظاہر مشکل مفہوم کو قابلِ قبول اور ہم آہنگ بنا دیتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان ﴿فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَأَىٰ كَوْكَبًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي﴾[21] میں بظاہر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ستارے کو رب کہا، حالانکہ ایسا عقیدہ کفر ہے اور انبیاء علیہم السلام اس سے معصوم ہوتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ اس ظاہری معنی کو قبول نہیں کرتے اور واضح کرتے ہیں کہ یہ جملہ حقیقی عقیدے کے طور پر نہیں بلکہ سیاقِ کلام کے مطابق سمجھنا چاہیے۔ ان کے نزدیک آیت کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی معرفت و یقین کے بلند مقام پر فائز تھے، لہٰذا ان کے لیے شرک کا امکان نہیں۔

امام فخر الدین رازیؒ نے حضرت ابراہیمؑ کے قول ﴿هَٰذَا رَبِّي﴾ کے بارے میں متعدد توجیہات بیان کی ہیں تاکہ اس اشکال کو دور کیا جا سکے کہ انبیاء علیہم السلام شرک سے معصوم ہوتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ جملہ حقیقی عقیدے کے طور پر نہیں کہا گیا، بلکہ اس کے مختلف اسالیبِ بیان ہو سکتے ہیں، جیسے: قوم کے قول کی نقل، طنزیہ انداز، انکاری استفہام، یا مناظرانہ طرزِ گفتگو وغیرہ۔ بعض توجیہات کے مطابق یہ بات بطورِ جدل یا وقتی موافقت کے طور پر کہی گئی تاکہ حقیقت واضح کی جا سکے۔

ان تمام توجیہات سے امام رازیؒ یہ واضح کرتے ہیں کہ اس آیت کا ظاہری مفہوم مراد لینا درست نہیں، بلکہ اسے سیاق، مقصد اور اسلوبِ کلام کے مطابق سمجھنا ضروری ہے۔[22]

4۔ مشکل کو محکم پر محمول کرنا: امام فخر الدین رازیؒ کے نزدیک جب کسی آیت میں بظاہر اشکال پیدا ہو تو اسے محکم آیات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔ وہ مشکل آیات کے معنی کو ایسی سمت میں لے جاتے ہیں جو اگرچہ لغوی اعتبار سے مرجوح ہو، لیکن سیاق اور دیگر نصوص کے مطابق زیادہ درست ہو۔ اس کی مثال ﴿نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ﴾[23] ہے، جہاں "بھول جانا" اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے حقیقی معنی میں محال ہے۔ اس لیے امام رازیؒ اسے مجازی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ ان کے مطابق "نسیان" کا مرجوح معنی "چھوڑ دینا" ہے، جو اس آیت میں مراد ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت اور توفیق سے محروم کر دیا۔

اس کی تائید محکم آیات سے ہوتی ہے، جیسے ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾[24] اور ﴿لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى﴾[25]، جن سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نسیان سے پاک ہے۔ اس طرح امام رازیؒ مشکل آیات کو محکم آیات پر محمول کر کے اشکال کو دور کرتے ہیں۔[26]

5۔ لفظ کے معنی کی وضاحت (لغوی پہلو سے): امام فخر الدین رازیؒ کے نزدیک جب کسی آیت میں اشکال کسی لفظ کے غیر مانوس یا مشتبہ استعمال کی وجہ سے پیدا ہو تو اس کے حل کے لیے لغوی مصادر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور لفظ کے صحیح معنی کو عربی استعمال اور قرآن کے اسلوب کی روشنی میں واضح کیا جاتا ہے۔

اس کی مثال ﴿مِن وَرَائِهِ جَهَنَّمُ﴾[27] ہے، جس میں لفظ "وراء" کے استعمال پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جہنم تو سامنے ہے، پھر اسے "پیچھے" کیوں کہا گیا؟ امام رازیؒ اس کے حل میں دو لغوی اقوال ذکر کرتے ہیں: ایک یہ کہ "وراء" اضداد میں سے ہے، اس لیے یہ آگے اور پیچھے دونوں معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد "بعد" ہے، یعنی انجام اور انجام کے بعد آنے والا مرحلہ، جو جہنم ہے۔

ان لغوی توجیہات سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت میں کوئی اشکال نہیں، بلکہ لفظ اپنے عربی استعمال کے مطابق درست معنی دیتا ہے۔

6۔ بلاغی لطائف اور قرآنی اسلوب کی وضاحت: امام فخر الدین رازیؒ کے نزدیک قرآنِ کریم کی بلاغت، نظم اور اسلوب میں ایسے باریک لطائف موجود ہیں جو بظاہر اختلاف یا اشکال کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے مطابق قرآن کا اعجاز اسی دقیق ترتیب اور فصیح بیان میں پوشیدہ ہے۔[28]

اس کی مثال دو آیات میں ملتی ہے: ایک میں ﴿يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ﴾[29] اور دوسری میں ﴿يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ﴾[30]۔ بظاہر دونوں میں "واوَ" کے استعمال کا فرق محسوس ہوتا ہے۔ امام رازیؒ کے مطابق سورۂ بقرہ میں يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ پہلے جملے کی وضاحت ہے، اس لیے وہاں "واوَ" نہیں لائی گئی، کیونکہ تفسیر میں عطف مناسب نہیں ہوتا۔ جبکہ سورۂ ابراہیم میں "واوَ" اس لیے استعمال ہوئی ہے کہ یہاں بیٹوں کو ذبح کرنا ایک مستقل اور الگ عذاب کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس بلاغی نکتے کو سمجھنے سے دونوں آیات کا ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور قرآن کے اسلوب کی دقیق خوبصورتی واضح ہو جاتی ہے۔[31]

اور بعض اوقات امام فخر الدین رازیؒ ایسا مفہوم بھی اختیار کرتے ہیں جو سابق مفسرین میں صراحتاً منقول نہیں ہوتا، لیکن وہ سیاقِ کلام، نظم اور بلاغت کے زیادہ موافق ہوتا ہے۔

اس کی مثال ﴿وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ﴾[32] میں ملتی ہے۔ امام رازیؒ کے نزدیک اس آیت کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان کچھ اختلاف اور اشکال پایا جاتا ہے، اس لیے انہوں نے سابقہ اقوال پر نقد کرتے ہوئے "فرقان" کی ایک نئی توجیہ اختیار کی۔ ان کے مطابق "فرقان" سے مراد وہ معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو آسمانی کتابوں کے ساتھ عطا کیے، تاکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز واضح ہو اور سچے نبی اور مدعیِ نبوت میں فرق قائم ہو سکے۔

امام رازیؒ اپنی اس ترجیح کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ یہ قول سابق مفسرین میں صراحتاً موجود نہیں، لیکن یہ معنی کلام کی قوت، الفاظ کی فصاحت اور نظمِ قرآن کے زیادہ قریب ہے، جبکہ دیگر اقوال اس جامعیت اور مناسبت کو پوری طرح ظاہر نہیں کرتے۔ اس لیے ان کے نزدیک یہی توجیہ زیادہ راجح اور مناسب ہے۔[33]

7۔ اشکالات کے ازالے میں عقلی استدلال اور ظاہری معنی سے تاویل کی طرف رجوع: اشاعرہ کے نزدیک عقلی دلیل ایک بنیادی اور مضبوط اصول کی حیثیت رکھتی ہے، اور امام فخر الدین رازیؒ نے اسے نہایت وسعت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، خصوصاً اپنی کتاب "تأسیس التقدیس" میں۔ ان کے نزدیک بعض مواقع پر عقل کو نقلی دلائل پر ترجیح حاصل ہوتی ہے۔

اگر عقل اور نقل میں موافقت ہو تو کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر بظاہر تعارض پیدا ہو جائے تو صورتِ حال مختلف ہوتی ہے: اگر نقلی دلیل قطعی نہ ہو تو اسے قابلِ رد یا غیر محکم سمجھا جا سکتا ہے، اور اگر وہ قطعی ہو (جیسے قرآن مجید) تو پھر اس کی تاویل کی جاتی ہے یا بعض اوقات تفویض کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، یعنی معنی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح امام رازیؒ کے نزدیک عقلی دلیل کے ذریعے ان اشکالات کو دور کیا جاتا ہے جو نصوص کے ظاہری مفہوم سے پیدا ہوتے ہیں،

اور ضرورت کے مطابق ظاہری معنی سے ہٹ کر مناسب اور قابلِ قبول تاویل اختیار کی جاتی ہے۔[34]

اکثر امام فخر الدین رازیؒ اس طرزِ استدلال کو خصوصاً اسماء و صفات کی آیات میں اختیار کرتے ہیں، کیونکہ یہ مسائل مختلف کلامی مکاتب کے درمیان محلِ اشکال بنے ہوئے ہیں، نہ کہ اپنی اصل میں۔

اس کی مثال ﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ﴾ ہے۔ یہاں "ید" کو اس کے ظاہری جسمانی معنی پر لینا درست نہیں، کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانیت لازم آتی ہے جو محال ہے۔

امام رازیؒ اس مقام پر سلف کے اس موقف کو ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایسی صفات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی کیفیت کو اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ جبکہ متکلمین نے "ید" کے مختلف مجازی معانی بیان کیے ہیں، جیسے نعمت، قدرت، ملک (اختیار) اور خاص عنایت۔

امام رازیؒ کے عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جسمانی ہاتھ مراد لینا محال ہے، البتہ دیگر معانی لغوی اور عقلی اعتبار سے ممکن ہیں، اس لیے انہی کو اختیار کیا جائے گا یا تفویض کا راستہ اپنایا جائے گا۔[35]

8۔ کلامی اور منطقی استنباطات کے ذریعے اشکال کا ازالہ: امام فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں کلامی اور منطقی مباحث سے خاص طور پر استفادہ کرتے ہیں اور مشکل آیات کو ان اصولوں کی روشنی میں واضح کرتے ہیں۔

اس کی مثال ﴿قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ﴾[36] ہے، جس کے ظاہری مفہوم سے بعض لوگوں کو یہ اشکال پیدا ہوا کہ گویا اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کے امکان کا پہلو پایا جاتا ہے، اس لیے انہوں نے اس کی تاویل کی کوشش کی۔

امام رازیؒ کے نزدیک یہاں تاویل کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ایک شرطیہ جملہ ہے۔ منطقی اصول کے مطابق شرطیہ قضیہ صرف شرط اور جزا کے ربط کو بیان کرتا ہے، نہ کہ ان کے وقوع کو لازم قرار دیتا ہے۔ یعنی مطلب یہ ہے کہ "اگر (بالفرض) اللہ کے لیے اولاد ہو تو میں اس کی عبادت کرنے والوں میں پہلا ہوں"، حالانکہ نہ ایسی کوئی اولاد ہے اور نہ ہی اس کے امکان پر کوئی دلیل موجود ہے۔

امام رازیؒ کے مطابق اس اسلوب کا مقصد یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ عناد یا محض انکار کی بنیاد پر بات نہیں کرتے، بلکہ اگر بالفرض کوئی قطعی دلیل سامنے آجائے تو وہ بھی حق کو قبول کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ ایسی کوئی

دلیل موجود نہیں، اس لیے آیت اپنے واضح اور منطقی مفہوم میں بالکل درست اور بے اشکال ہے، اور اس کے لیے کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔[37]

نتائج: مذکورہ بحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "متشابہ" اور "مشکل" کے درمیان لغوی اور اصطلاحی اعتبار سے ایک نوع کا تداخل پایا جاتا ہے، کیونکہ دونوں میں معنی کے مخفی ہونے اور اس کے فہم کے لیے دلیل و استنباط کی ضرورت مشترک ہے۔

محقق کے نزدیک "مشکل القرآن" سے مراد وہ مقامات ہیں جن کا معنی واضح نہ ہو، یا وہ کسی دوسری نص کے ساتھ مشتبہ ہو جائے، یا کسی شرعی، لغوی یا عقلی اصول کے ساتھ بظاہر متعارض نظر آئے۔

قرآنِ کریم میں ایسے مقامات کی موجودگی کے کئی حکمتیں ہیں، جن میں قرآن کے اعجاز کا اظہار، شریعت کی وسعت اور لچک کا بیان، اہلِ علم کے مقام کی بلندی، اور صحیح فہم و تدبر کی اہمیت کو اجاگر کرنا شامل ہے۔ اس کے ساتھ یہ ایمان کا امتحان بھی ہے اور عقل و فکر کو بروئے کار لانے کی دعوت بھی۔

مشکل القرآن کے اسباب کو مجموعی طور پر چند بنیادی اقسام میں سمیٹا جا سکتا ہے، جیسے ظاہری تعارض کا گمان، لغوی ابہام، قراءتوں کا اختلاف، اور فہم و استعداد کا نسبتی فرق۔

امام فخر الدین رازیؒ نے "مشکل القرآن" کے موضوع کو خاص اہمیت دی، جس کا اظہار ان کی علمی خدمات اور تصانیف جیسے التفسير الكبير اور نهاية الإيجاز في دراية الإعجاز سے واضح ہوتا ہے، جہاں انہوں نے نہ صرف اصطلاحات کی توضیح کی بلکہ قرآنی مشکلات کے حل کے اصول بھی بیان کیے۔

انہوں نے مشکل القرآن کے حل میں ایک منظم منہج اختیار کیا، جس میں آیات کے درمیان تطبیق، نسخ کی وضاحت، بظاہر ناممکن معانی کی توجیہ، قراءتوں کی شرح، لغوی تحقیق اور قرآنی اسلوب و عرف کا لحاظ شامل ہے۔

امام رازیؒ کا نمایاں امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے عقلی دلائل، کلامی و منطقی اصول اور تاویل کو کثرت سے استعمال کیا، اور بلاغی نکات کو بھی اشکالات کے ازالے میں بنیادی حیثیت دی۔

حواشی

[1] ۔ قزوینی، احمد بن فارس بن زکریا الرازی، معجم مقاییس اللغۃ، محقق: عبد السلام محمد ہارون، دارالفکر، بیروت ،1399ھ /1979ء، ج3، ص204

[2] ۔ ابن منظور، محمد بن مکرم، ابو الفضل، جمال الدین، انصاری، رویفعی، افریقی، لسان العرب، دار صادر ،بیروت، 1414ھ /1994، مادہ: (ش ک ل)

[3] ۔ فیروزآبادی، مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، مؤسسۃ الرسالۃ ،بیروت ،لبنان، 1426ھ / 2005ء، مادہ: (ش ک ل)

[4] ۔ دینوری، ابو محمد عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ، تأویل مشکل القرآن، محقق: ابراہیم شمس الدین، دارالکتب علمیہ، بیروت، ص68

[5] ۔ زرکشی، بدر الدین محمد بن عبد اللہ بن بھادر .البرھان في علوم القرآن .محقیق: محمد أبو الفضل إبراھیم. پہلی اشاعت، 1384ھ /1957ء، دار إحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ، ج2، ص69

[6] ۔ قُصیِّر، ڈاکٹر احمد، الاحادیث المشکلہ الواردہ فی تفسیر القران الکریم، ص26

[7] ۔ سورۃ الإسراء: 97

[8] ۔ سورۃ الکہف: 53

[9] ۔ سورۃ الفرقان: 12

[10] ۔ سورۃ النحل: 111

[11] ۔ سورۃ الأنعام: 23

[12] ۔ الرازی، ابو عبد اللہ محمد بن عمر، مفاتیح الغیب، دارالفکر، بیروت، 1981، ج11، ص412

[13] ۔ سورۃ الرحمن: 14

[14] ۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج29، ص348

[15] ۔ سورۃ البقرہ: 234

[16] ۔ سورۃ البقرہ: 240

[17] ۔ الرازی، ابو عبد اللہ محمد بن عمر، المحصول، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، 1997، ج3، ص322

[18] ۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج6، ص492

[19] ۔ سورۃ ہود: 78

[20]۔ سورۃ سورۃ الاحزاب:6

[21]۔ سورۃ الأنعام:76

[22]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج13، ص40

[23]۔ سورۃ التوبہ:67

[24]۔ سورۃ مریم:64

[25]۔ سورۃ طٰہٰ:52

[26]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج19، ص79

[27]۔ سورۃ ابراہیم:16

[28]۔ الرازی، نہایۃ الاعجاز فی درایۃ الاعجاز، دار صادر، بیروت، 2001، ص26

[29]۔ سورۃ البقرہ:49

[30]۔ سورۃ ابراہیم:6

[31]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج19، ص66

[32]۔ سورۃ آلِ عمران:4

[33]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج7، ص133

[34]۔ الرازی، تاسیس التصدیق، تحقیق: احمد حجازی السقا، مکتبہ کلیہ اظہریہ، 1986، ص220

[35]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج12، ص395

[36]۔ الزخرف:81

[37]۔ الرازی، مفاتیح الغیب، ج27، ص646